مُسلمانوں کی سیاسی و مِلّی زندگی

کے رہنما اُصول

سُورۂ ’الحجرات‘ کی روشنی میں

انسان کی عملی زندگی کے ذیل میں اس منتخب نصاب میں چھٹا اور آخری مقام سورۂ حجرات مکمل ہے۔ یہ عظیم سورت اجتماعیاتِ انسانی کے ذیل میں عام سماجی و معاشرتی معاملات سے بلند تر سطح پر نہ صرف قومی و ملّی امور سے بحث کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ملّت اسلامیہ کی تاسیس اور تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق اور یک جہتی و ہم رنگی کیسے برقرار رکھی جاسکتی ہے بلکہ سیاست و ریاست کے متعلق امور سے بھی بحث کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کس بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اس کا دستور اساسی کیا ہے، اس کی شہریت کیسے حاصل ہوتی ہے اور اس کا دُنیا کے دوسرے معاشروں یا اس کی دوسری ریاستوں سے تعلق کن بنیادوں پر استوار ہوگا۔

اس سورت کو بغرض تفہیم تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیئے۔

پہلا حصہ مُسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے ’اصل الاصول‘، یعنی اسلامی ریاست کے دستور اساسی اور ملّت اسلامیہ کی شیرازہ بندی [1] کے اصل قوام یعنی ”مرکزِ ملّت“ سے بحث کرتا ہے۔

چنانچہ پہلی ہی آیت نے غیر مبہم طور پر واضح کر دیا کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی ریاست ’مادر پدر آزاد‘ نہیں بلکہ اللہ اور اسکے رسول کے احکام کے ’پابند‘ ہیں، اور مسلمانوں کی آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا اور رسول کی اطاعت کے لئے دوسری ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ گویا کہ ایک فرد کی طرح اجتماعیت بھی صرف وہی ’مسلمان‘ قرار دی جاسکتی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تشبیہ کے مطابق اسی

---

[1] کتابِ ملّت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے ۔۔۔ یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

طرح اللہ اور اس کے رسول صلعم کے احکام کے ساتھ بندھی ہوئی ہو جیسے ایک گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ آیت مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے اصل الاصول یعنی ایک اسلامی ریاست کے دستور اساسی میں حاکمیت سے متعلق اولین دفعہ کو متعین کر دیتی ہے کہ یہاں حاکمیت نہ کسی فرد کی ہے نہ طبقے کی، نہ قوم کی ہے نہ جمہور کی بلکہ صرف خدا کی ہے (اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ) اور اسلامی ریاست کا کام (FUNCTION) صرف یہ ہے کہ رسولؐ کی تشریح و توضیح کے مطابق خدا کی مرضی و منشا کو پورا کرے۔ ۱؎

آیت کے آخر میں اس اطاعت کی اصل روح کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی تقوی اللہ۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی "اصل ثانی" کو واضح کیا گیا جس کے گرد مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی اصل شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب، آپ کی تعظیم و توقیر، آپ سے محبت اور عشق اور آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہی (وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ) اور ہر اس قول و فعل یا رویے اور برتاؤ سے کامل اجتناب جس سے ادنیٰ ترین درجے میں بھی گستاخی یا تحقیر و توہین کا پہلو نکلتا ہو (کہ "ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر!")

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی ان دو بنیادوں میں سے پہلی چونکہ عقیدۂ توحید فی الالوہیت کا لازمی نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے گویا قرآن حکیم کے ہر صفحے پر بطرز جلی اس کا ذکر موجود ہے لہذا اس مقام پر اس کا ذکر صرف ایک آیت میں کر دیا گیا۔ اس کے بالمقابل اصل ثانی پر انتہائی زور دیا گیا۔ اور بعض متعین واقعات پر گرفت اور سرزنش کے ضمن میں واضح کر دیا گیا کہ ؎

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

اس لئے کہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں ملت اسلامیہ کے پاس وہ "مرکزی شخصیت" موجود ہے جس سے تمدن انسانی کی وہ فطری ضرورت بتمام و کمال اور بغیر تصنع و تکلف پوری ہو جاتی ہے جس کے لئے دوسری قوموں کو باقاعدہ تکلف و اہتمام کے ساتھ شخصیتوں کے بت تراشنے اور "ہیرو" (HEROES) گھڑنے کا کھکیڑ مول لینا پڑتا ہے۔ مزید برآں دنیا کی دوسری اقوام تو "ہمی تراشد فکر ما ہر دم خداوند دیگر

دگر"! کے مصداق مجبور ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شخصیت کا بت تراشیں، لیکن ملّتِ اسلامیہ کے پاس ایک دائم و قائم مرکز، موجود ہے جو اُس کے ثقافتی تسلسل (CULTURAL CONTINUITY) کا ضامن ہے، (اس اعتبار سے دیکھا جائے تو "اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ" میں خطاب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے نہیں بلکہ تاقیامِ قیامت پوری اُمّت مسلمہ سے ہے) اس دوام اور تسلسل کے ساتھ ساتھ، اُمّت مسلمہ کی وسعت اور پھیلاؤ پر بھی نگاہ رہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی "مرکزیت" ہی کا ثمرہ ہے کہ مشرق اقصیٰ سے لے کر مغرب بعید تک پھیلی ہوئی قوم میں نسل و لسان کے شدید اختلاف اور تاریخی و جغرافیائی عوامل کے انتہائی بُعد کے علی الرغم ایک گہری ثقافتی یک رنگی (CULTURAL HOMOGENIETY) موجود ہے۔ اور اسی کی فرع کے طور پر اس حقیقت پر بھی ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیئے کہ مختلف مسلمان ممالک میں علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور علاقائی شخصیتوں، کو بس ایک حد تک ہی ابھارنا چاہیئے، اس سے تجاوز کی صورت میں اس سے "وحدتِ ملّت" کی جڑیں کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا بقول علّامہ اقبال ؎

یہ زائرینِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

روئے زمین کی تمام مسلمان اقوام کو معیار قیادت ایک ہی رکھنا چاہیئے اور وہ ہے ذاتِ محمدؐ فداہ ابی و امّی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی متذکرہ بالا دو بنیادوں میں سے ایک زیادہ عقلی و منطقی ہے اور دوسری نسبتاً جذباتی، پہلی پر دستور و قانون کا دار و مدار ہے اور دوسری پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوتی ہے اور ان دونوں کا باہمی رشتہ ایک دائرے اور اُس کے مرکز کا ہے۔ مسلمان اجتماعیت کے اس دائرے میں محصور ہے جو خدا اور اُس کے رسول کے احکام نے کھینچ دیا ہے اور اس کے مرکز کی حیثیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلآویز اور دلنواز شخصیت کو حاصل ہے جن کے اتّباع کے جذبے سے اس ہیئت اجتماعی کو ثقافتی یکرنگی نصیب ہوتی ہے اور جن کی محبت کے رشتے سے اس کے افراد ایک مرکز سے بھی وابستہ رہتے ہیں اور باہم اگر بھی جڑے رہتے ہیں

(اب اس معذرت کے ساتھ آگے چلتا ہوں کہ مقام رسالت، کے ذکر میں طول کلام فی الواقع عہ "لذید بود حکایت دراز تر گفتیم!" کے مصداق ہے)

دوسرا حصّہ ان احکامات پر مشتمل ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے ملّت اسلامیہ کے افراد اور گروہوں اور جماعتوں کے مابین رشتۂ محبت و اُلفت کے کمزور ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اختلاف و انتشار اور فتنہ و فساد کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ ان احکامات کو بھی مزید دو عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ اہم تر احکام جو وسیع تر پیمانے پر گروہوں کے مابین تصادم سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے وہ بظاہر چھوٹے لیکن حقیقتہً نہایت بنیادی احکام جو خالص انفرادی سطح پر نفرت اور عداوت کا سدِّ باب کرتے ہیں۔

مقدم الذکر احکام دو ہیں: ۱۔ افواہوں کی روک تھام اور کسی حتمی فیصلے اور عملی اقدام سے قبل اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور چھان بین کا اہتمام[۱] اور ۲۔ نزاع کے واقع ہو جانے کی صورت میں صحیح طرزِ عمل ــ یعنی ا: یہ کہ فریقین کے مابین صلح کرانے کو اجتماعی ذمّہ داری اور معاشرتی فرض سمجھا جائے گویا کہ لاتعلقی (INDIFFERENCE) کی روش کسی طور صحیح نہیں، ب: اس کے بعد بھی اگر ایک فریق زیادتی ہی پر مُصر رہے تو اب اس کا مقابلہ صرف فریق ثانی ہی کو نہیں پوری ہیئتِ اجتماعیہ کو کرنا چاہیئے اور ج: جب وہ گردن جھکا دے تو از سرِ نو عدل و قسط پر مبنی صلح کرا دی جائے۔ (اس مقام پر عدل اور قسط کا مکرّر موکّد ذکر خاص طور پر اس لئے ہے کہ جب پوری ہیئتِ اجتماعیہ اس فریق سے ٹکرائے گی تو فطری طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ دوبارہ صلح میں اس فریق پر غصّے اور جھنجھلاہٹ کی بنا پر زیادتی ہو جائے!)

موخر الذکر احکام چھ نواہی پر مشتمل ہیں یعنی ان میں ان چھ معاشرتی برائیوں سے منع

---

[۱] اس سلسلے میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظ مبارک مستحضر رہنے چاہئیں کہ "کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ" ایک شخص کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ بات بالکل کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اُسے آگے بیان کر دے (یعنی آگے بیان کرنے سے قبل اس کی صحت کی تحقیق و تصدیق نہ کرے!)

فرمایا گیا ہے جن کے باعث بالعموم دو افراد یا گروہوں کے مابین رشتۂ محبت والفت کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ نفرت وعداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور ایسی کدورت پیدا ہو جاتی ہیں جو پھر کسی طرح نہیں نکلتی ۔ اس لئے کہ عام ضرب المثل کے مطابق تلواروں کے گھاؤ بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے! وہ چھ چیزیں یہ ہیں ۔ ۱ ۔ تمسخر (اس کے سدباب کے لئے اس نہایت گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے تمسخر کا مرتکب ہو بیٹھتا ہے حالانکہ اصل چیز انسان کا باطن ہے اور خدا کی نگاہ میں انسانوں کی قدر وقیمت اُن کے باطن کی بنیاد پر ہے) ۲ ۔ عیب جوئی اور تہمت (اس کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو کسی دوسرے مسلمان کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ کو عیب لگانا ہے) ۳ ۔ تنابز بالالقاب، یعنی لوگوں یا گروہوں کے توہین آمیز نام رکھ لینا (اس کے ضمن میں اشارہ فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد بُرائی کا نام بھی نہایت بُرا ہے) ۴ ۔ سوءظن (اس لئے کہ بہت سے ظن گناہ کے درجے میں ہیں) ۵ ۔ تجسس اور ۶ ۔ آخری اور اہم ترین، غیبت جس کی شناعت کے اظہار کے لئے حد درجہ بلیغ تشبیہ اختیار کی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کی غیبت ایسی ہے جیسے کسی مردہ بھائی کا گوشت کھانا ۔ (اس لئے کہ جس طرح ایک مردہ اپنے جسم کا دفاع نہیں کر سکتا اسی طرح ایک غیر موجود شخص بھی اپنی عزت کے تحفظ پر قادر نہیں ہوتا ۔

الغرض ان آٹھ اوامر ونواہی سے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کا استحکام مطلوب ہے ۔ اس لئے کہ جس طرح بڑی سے بڑی فصیل بھی بہرحال اینٹوں ہی سے بنی ہوتی ہے اور اس کے استحکام کا دارومدار جہاں اینٹوں کی پختگی اور مضبوطی پر ہوتا ہے وہاں اینٹوں کو جوڑنے والے گارے یا چونے یا کسی دیگر مسالے (CEMENT SUBSTANCE) کی پائیداری پر بھی ہوتا ہے ۔ اسی طرح ملت اسلامیہ کے استحکام کے لئے بھی جس قدر مسلمانوں میں سے ہر ہر فرد کا سیرت وکردار کے اعتبار سے پختہ ہونا ضروری ہے اسی قدر اُن کے مابین رشتۂ محبت والفت کی استواری بھی لازمی ہے ۔ یہ البتہ واضح رہے کہ ملت اسلامیہ کا استحکام عام قومی تصورات کے تحت دنیوی غلبہ واقتدار کے لئے نہیں بلکہ اس لئے

مطلوب ہے کہ وہ ع۔ "ہم تو جیتے ہیں کہ دُنیا میں ترا نام رہے!" کے مصداق خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کا ذریعہ اور آلہ (INSTRUMENT) بنے!

تیسرا حصہ دو انتہائی اہم مباحث پر مشتمل ہے:

۱۔ پہلی بحث انسان کی عزّت و شرف کے معیار سے متعلق ہے جس کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عزّت و ذلّت یا شرافت و رذالت کا معیار نہ کنبہ ہے نہ قبیلہ، نہ خاندان ہے نہ قوم، نہ رنگ ہے نہ نسل، نہ ملک ہے نہ وطن، نہ دولت ہے نہ ثروت، نہ شکل ہے نہ صورت، نہ حیثیت ہے نہ وجاہت، نہ پیشہ ہے نہ حرفہ اور نہ مقام ہے نہ مرتبہ بلکہ صرف 'تقویٰ' ہے اس لئے کہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی خدا کی مخلوق بھی ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے (آدم و حوّا) کی اولاد بھی۔

یہ بحث فی نفسہٖ بھی نہایت اہم ہے اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں بدامنی اور انتشار اور انسانوں کے مابین تصادم اور ٹکراؤ کا بہت بڑا سبب نسل اور نسب کا غرور ہی ہے اور یہ قومی گروہی مفاخرت ہی ہے جو مابین الانسانی منافرت کا اصل سبب بنتی ہے (اس سلسلے میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن[1] دشمن بھی معترف ہیں کہ آپ نے واقعۃً انسانی عزّت و شرف کی متذکرہ بالا تمام غلط بنیادوں کو منہدم کر دیا اور انسانی مساوات اور اخوّت کی بنیادوں پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا!) لیکن خاص طور پر اس مقام پر اس بحث کے دو رُخ لائق توجہ ہیں — ایک[1] یہ کہ اوپر جن سماجی برائیوں سے منع فرمایا گیا تھا مثلاً تمسخر و استہزاء اور عیب جوئی و بدگوئی ان کی جڑ میں جو گمراہی کارفرما ہے وہ اصل میں یہی نسل و نسب کی بنیاد پر تفاخر و تعالی کا جذبہ ہے اور — دوسرے[2] یہ کہ

---

[1] چنانچہ ایچ جی ویلز (H. G. WELLS) اپنی "مختصر تاریخ عالم" میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۂ حجۃ الوداع کے ذیل میں واضح طور پر اقرار کیا ہے کہ انسانی مساوات اور اخوّت کے نہایت اونچے وعظ تو اگرچہ مسیح ناصری (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی موجود ہیں لیکن ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی بار ایک معاشرے کا واقعی قیام صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم اوفداہ ابی وامی) کا کارنامہ ہے۔

اسلام ان میں سے کسی چیز کی بنیاد پر انسانوں کے مابین تفریق و تقسیم کا قائل نہیں بلکہ وہ ایک خالص نظریاتی معاشرہ اور ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے یہاں انسانوں کے مابین صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے ایمان کی تقسیم اور اہل ایمان کے حلقے میں بھی اس کے نزدیک صرف ایک معیار عزت و شرف معتبر ہے اور وہ ہے تقویٰ کا معیار!

اس سلسلے میں ضمنی طور پر ایک دوسری نہایت اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا یعنی یہ کہ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا باقی انسانی معاشروں اور ریاستوں سے ربط و تعلق ان دو بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے جو پوری نوع انسانی کے مابین مشترک ہیں یعنی ۱۔ وحدتِ الٰہ اور ۲۔ وحدتِ آدم۔ اسی اہم حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے اس مقام پر تخاطب اس سورت کے عام اسلوب سے ہٹ کر بجائے "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ" سے ہوا (واضح رہے کہ قرآن حکیم میں سورہ حجرات کی اس آیت مبارکہ کا مثنیٰ سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے جس میں یہ تمام حقائق ایک عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں)

۲۔ دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق و تمیز کی وضاحت سے متعلق ہے!

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں ایمان و اسلام اور مومن و مسلم کی اصطلاحات اکثر و بیشتر ہم معنی اور مترادف الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اور ایمان انسان کی جس داخلی کیفیت کا نام ہے اسلام اس کا خارجی ظہور ہے، لہٰذا جو انسان قلب میں ایمان و یقین کی دولت رکھتا ہو اور عمل میں اسلام اور اطاعت کی روش اختیار کرلے اسے "اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی"، ایک انگریزی مقولے[1] کے مصداق چاہے مومن کہہ لیا جائے چاہے مسلم بات ایک ہی ہے؛ بخلاف اس مقام کے کہ یہاں ایمان و اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے اور ایمان کی نفی کامل کے علی الرغم اسلام کا اثبات کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس بحث کے لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ اہم اور بنیادی حقیقت

[1] 'CALL THE ROSE BY ANY NAME: IT WILL SMELL AS SWEET'

واضح ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے بلکہ اسلام پر ہے، اس لئے کہ ایمان ایک باطنی حقیقت ہے جو کسی قانونی بحث و تفتیش اور ناپ تول کا موضوع نہیں بن سکتی۔ لہٰذا مجبوری ہے کہ دنیا میں بین الانسانی معاملات کو صرف خارجی رویّے کی بنیاد پر استوار کیا جائے جس میں ایمان کا زیادہ سے زیادہ صرف "اِقْرَارٌ بِاللِّسَان" والا پہلو شامل ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس بحث سے دو مزید عظیم حقائق کی جانب رہنمائی ہو گئی

ایک[1]: یہ کہ انسان کی ایک ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ اس کی دل میں نہ تو مثبت و ایجابی طور پر ایمان ہی متحقق ہو نہ منفی و سلبی طور پر نفاق۔ بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت ہو لیکن اس کے عمل میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت موجود ہو۔ اس حال میں اگرچہ اس قاعدہ کلیہ کی رُو سے کہ بغیر ایمان انسان کا کوئی عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز بھی مبنی بر عدل ہی ہوتی کہ ایسی اطاعت قبول نہ کی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے (جس کی جانب اشارہ دو اسمائے حُسنیٰ "غفورٌ" اور "رحیمٌ" سے کر دیا گیا) کہ اس اطاعت کو بھی سندِ قبول عطا فرما دی گئی۔ (واضح رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں جب "وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا" کی صورت ہوئی تو اس وقت بھی بہت سے لوگوں کے ایمان و اسلام کی نوعیت یہی تھی اور بعد میں تو ہر دور میں امت مسلمہ کے سوادِ اعظم کا حال یہ رہا ہی ہے!)

دوسرے یہ کہ حقیقی ایمان کی بھی ایک جامع و مانع تعریف بیان ہو گئی، اور واضح کر دیا گیا کہ فی الحقیقت ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے پختہ یقین کا جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے نہ رہ گئے ہوں اور جس کا اوّلین اور نمایاں ترین عملی مظہر جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی یہ کہ انسان ہدایت آسمانی کی نشر و اشاعت اور حق کی شہادت، اور اللہ کے دین کی تبلیغ و تعلیم اور اس کے غلبہ و اظہار کے لئے جان و مال سے کوشش کرے اور اس جد و جہد میں تن من دھن سب کو قربان کر دے۔ آیت کے آخر میں مزید کھول دیا گیا کہ صرف ایسے ہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں

---

[1] واضح رہے کہ دوسرے ایمانیات ان کے ذیل میں آپ سے آپ مندرج ہو گئے۔